مولانا سید عبداللہ کاکاخیل
فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ

چند ہفتے
دیارِ عرب میں

مدینہ سے عمان تک

بلادِ عربیہ کی سیر و سیاحت، عربی زبان اور عربی ثقافت سے واقفیت حاصل کرنے کا ولولہ بچپن سے قلب میں جوش زن تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جامعہ اسلامیہ کی طالب علمی کی صورت میں مسلسل چار سال تک مدینہ منورہ میں قیام کا شرف عطا فرماکر میری یہ دیرینہ تمنا پوری کردی ــــــ حجازِ مقدس کے بعد شام و فلسطین کی مبارک سرزمین دیکھنے کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ چنانچہ جامعہ اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہو کر وطن آنے سے قبل میں اپنے ہمدرس رفیقِ محترم مولانا عبدالرزاق و مولانا حسن جان صاحب کی معیت میں ایک ماہ کے لئے اردن، شام، اور لبنان کے تفریحی دورہ پر گیا۔ اس سفر کے احوال و تاثرات تقریباً ہر روز ڈائری میں قلمبند کرتا رہا۔ برادرِ عزیز مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش پر یہ یومیات قارئین الحق کے ہدیہ نظر ہیں۔ ــــــ عبداللہ کاکاخیل ــــــ

منگل ۵ر جولائی ۱۹۶۶ء سعودی عرب کے مقامی وقت کے مطابق صبح سوا چار بجے ہمارا جہاز "مدینہ ایرپورٹ" سے عمان کے لئے اڑا۔ یہ دو انجنوں والا چھوٹا جہاز تھا۔ سوار ہوتے وقت جہاز کا ہوا باز ہم نے دیکھا۔ اسکی شکل و صورت سے بعض ساتھیوں کو گمان ہوا، کہ یہ انگریز ہے۔ مجھے بھی اس گمان کی تصدیق کرنے میں کوئی خاص تردد نہیں ہوا۔ کیونکہ عام طور پر سننے میں آتا ہے۔ کہ سعودی طیاروں کے ہواباز زیادہ تر امریکن یا یورپین ہوتے ہیں۔ تاہم اس تفکر میں میں محو ضرور ہوا کہ اس مقدس سرزمین مہبطِ وحی پر ایک غیر مسلم کو قدم رکھنے کا موقع کیونکہ دیا جا رہا ہے۔ جبکہ یہاں کے شرعی قانون میں غیر مسلموں کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی حدود میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کی وجہ ملکی ہوابازوں کا کم ہونا ہو تو اسلامی ممالک سے ہواباز طلب

کرنے سے بھی تو یہ کمی پوری کی جا سکتی ہے۔

میں اس تصور میں محو تھا کہ استنے میں جہاز کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ "چند لمحوں بعد ہمارا جہاز "مدینہ ایرپورٹ" کو چھوڑنے والا ہے۔ یہ جہاز سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑان کر کے دو گھنٹے چالیس منٹ کے عرصے میں عمان پہنچے گا۔ جہاز کے ہوا باز کا نام محمد اکرم ہے"

ہوا باز کا اسلامی نام سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ دینی جذبات کا تقاضہ یہی تھا کہ حرمین کی یہ مقدس اور پاک سرزمین ایسے ناپاک قدموں سے ملوث نہ ہو۔ رہا اس مسئلہ میں فقہا کا اختلاف اور دلیل کے اعتبار سے کسی پہلو کا راجح اور مرجوح ہونا تو اس سے اس وقت ہمارا کوئی سروکار نہیں تھا۔

جہاز چونکہ کم بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس لئے نیچے کا منظر کافی حد تک صاف نظر آ رہا تھا۔ مدینہ سے عمان تک کا پورا رستہ سنگلاخ وادیوں اور خشک پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ ابھی دو گھنٹے نہیں گذرنے پائے تھے کہ ہمارا جہاز "تبوک" کی لبستی کے اوپر پرواز کرنے لگا۔ جہاز کے ایک ملازم نے ہمیں بتلایا کہ یہ "تبوک" ہے۔ اس وقت اس تصور میں ڈوب جانا ایک طبعی امر تھا کہ یہ طویل مسافت جو ہم نے چشم زدن میں طے کر لی صحابہ کرام کے زمانے میں کتنا شاق اور جاں گداز سفر تھا۔ حجاز کی تڑپانے والی گرمی، مسافت کی اس دوری اور پھر سنگلاخ وادیوں اور خشک ریگستانوں کے خطرناک سفر نے "غزوہ تبوک" کو کتنا مشکل بنایا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے۔ کہ بہت سے منافقوں کا نفاق اس میں ظاہر ہوا۔ اور کئی مسلمان اسکی وجہ سے ابتلاء میں پڑ گئے۔ لیکن یہ صحابہ ہی کا مقام تھا کہ دین حنیف کی خاطر وہ اتنی عظیم قربانیاں پیش کر گئے۔ ان کا عشرِ عشیر بھی اگر آج کے مسلمان پیش کر دیں تو جن کی حالت کچھ سے کچھ ہو جائے

جہاز اعلان کے مطابق بالکل ٹھیک وقت پر "عمان" کے ایرپورٹ پر اترا۔ جہاز سے اترنے کیلئے سیڑھی پر پہلا ہی قدم رکھ کر اس شہر کی تہذیب و تمدن کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہم لگا سکے۔ ایرپورٹ پر بہت سے لوگ اپنے خویش و اقارب کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ لباس سب کا انگریزی تھا۔ مرد کوٹ پتلون اور عورتیں بدترین قسم کا عریاں لباس پہنے ہوئے کھڑی تھیں۔

ایسے ماحول میں ہم اپنے لباس اور وضع قطع کے اعتبار سے اوپرے   معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن ہماری اسی وضع قطع نے ایرپورٹ پر ہمیں فائدہ ضرور پہنچایا۔ کسٹم والوں نے ہمارے

سامان کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ حالانکہ یہاں تفتیش میں سختی ہونے کی وجہ سے مسافروں کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ محض ہمارے پاکستانی ہونے کا اعزاز تھا۔ اور ہمارا لباس پاکستانی ہونے کا ایک ظاہری ثبوت تھا۔

ایئرپورٹ سے ایک شاندار ٹیکسی پر سوار ہو کر ہم شہر گئے۔ یہاں کے ڈرائیور نو واردوں کو لوٹنے میں بڑے مشہور ہیں۔ نصف دینار سے کم کرایہ لینے پر ڈرائیور رضامند نہ ہوا۔ حالانکہ اصل کرایہ ربع دینار سے زیادہ نہ تھا۔ ڈرائیور کا یہ سلوک مجھے زیادہ نامانوس بھی معلوم نہ ہوا۔ کیونکہ خود ہمارے ملک میں بھی بہت سے دوکاندار، ڈرائیور اور نیچے طبقے کے دوسرے لوگ نو واردوں کی ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کرتے۔

"خندق النصر الجدید" میں ہم نے قیام کیا۔ یہ ایک متوسط درجے کا ہوٹل ہے۔ اور عمان کی مشہور جامع مسجد "المسجد الحسینی" کے قریب واقع ہے۔ تین چارپائیوں کا کمرہ ہم نے تیس قرش کی چارپائی کے حساب سے نوے قرش میں لے لیا۔ (اردنی دینار میں سو قرش ہوتے ہیں اور دینار ایک سٹرلنگ پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔)

یہاں کے معمولی اور متوسط ہوٹلوں میں اپنے ریسٹورنٹ کا انتظام نہیں ہوتا ہے۔ البتہ ہوٹل کے منتظمین وقت پر طعام مہیا کرنے پر مکلف ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہماری اس قسم کی خدمت عماد نامی ایک فلسطینی لڑکے کے سپرد رہی جو کہ سکول کی چھٹی جماعت کا طالب علم ہے۔ اور گرمی کی تعطیلات میں ہوٹل کی ملازمت کرتا ہے۔

عماد کی طرح غاصب یہودیوں کے مظالم کے شکار بے شمار سکول کے دوسرے فلسطینی لڑکے بھی فارغ اوقات میں اسی قسم کی معمولی ملازمت کرتے ہیں۔ ان میں بہت سے بچوں کے والدین کسی وقت اپنے ملک میں عزت اور آرام و راحت کی زندگی بسر کر چکے ہوں گے۔ لیکن آج ان کا آرام و راحت مفقود ہے۔ اور وہ پیٹ پالنے کیلئے اپنے بچوں سے اسی قسم کے معمولی کام کرانے پر مجبور ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں دھکیلے ہوئے ان ستم زدہ مہاجرین کی زبان حال مسلمانان عالم سے اپیل کرتی ہے۔ کہ وہ رنگ و نسل اور ملک و وطن کے فوارق سے بالاتر ہو کر اسرائیل کے وجود کو۔ جو عالم اسلامی کے قلب میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے، صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے متحد ہو جائیں۔

عصر کی نماز "مسجد الحسینی" میں پڑھ کر ہم "دار الاخوان المسلمین" میں گئے۔ چند اخوانی حضرات نے جو مکتبہ میں مطالعہ کر رہے تھے ہمارا اچھا استقبال کیا۔ اور طویل خوش آمدید کے بعد پاکستان

کے حالات دریافت کئے۔ ان کے سوالات زیادہ تر پاکستان میں دینی سرگرمیوں کے بارے میں تھے۔ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی سے وہ متعارف تھے۔ دونوں جماعتوں کے افکار و نظریات، طریقہ کار اور اس کے عملی نتائج سے بھی وہ کافی حد تک واقف تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں دوسرے دینی اداروں اور جماعتوں کے بارے میں انہوں نے دریافت کیا۔ میں نے خاص طور پر اپنے ملک کے اسلامی مدارس کے نظام سے ان کو متعارف کیا۔ کہ اس وقت ملک کے دونوں حصوں میں ہزار سے زیادہ اسلامی مدارس کام کر رہے ہیں۔ یہ مدارس اہل خیر کے تبرعات پر چلتے ہیں۔ حکومت کیطرف سے کسی قسم کی مالی امداد قبول کرنا ان کے مزاج اور اصول کے خلاف ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس تعلیم و تربیت کے نظام میں بالکل آزاد ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلباء ان سے فارغ ہو کر درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور دوسرے دینی مناصب سنبھالتے ہیں۔ اور اس طریقہ سے ان مدارس کے ذریعہ ملک میں دین کی ایک عظیم خدمت انجام پائی جارہی ہے۔

اخوانی حضرات سے جب ہم نے دریافت کیا کہ کیا ان کو "اردن" میں مکمل طور پر آزادی حاصل ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ظاہری عنوان تو آزادی کا ہے۔ لیکن حکومت جماعت کی ہر حرکت و سکون پر کڑی نگرانی رکھتی ہے۔ حکومت کو اخوان سے کسی قسم کی ہمدردی ہرگز نہیں ہے۔ البتہ "اخوان" سے حکومت کو یہ فائدہ ضرور ہے۔ کہ اشتراکیت اور شیوعیت کا مقابلہ کرنے میں اخوانی تحریک سے اسکو مدد مل رہی ہے۔ اور اسی مصلحت کی خاطر اخوان کو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہے۔

"اخوان" نے شربت وغیرہ پیش کر کے ہماری خاطر تواضع کی۔ اس کے بعد "رابطۃ العلوم الاسلامیہ" کے دفتر میں جانے کیلئے ہم نے اجازت طلب کر لی چنانچہ ان میں سے ایک صاحب رہنمائی کے لئے ہمارے ساتھ ہو گئے۔

رابطہ کے صدر "تیسیر ظبیان" صاحب کے نام ہمارے جامعہ کے ایک مخلص دوست عبدالعزیز اسعد نے خط دیا تھا۔ یہ خط ہم نے تیسیر ظبیان صاحب کو دے دیا۔ بظاہر اس میں ہمارا تعارف تھا۔ ظبیان صاحب بڑی خوش لقائی سے پیش آئے عربی قہوہ سے ہماری ضیافت کی۔ مغرب تک ہم ان کے ساتھ مصروف گفتگو رہے تیسیر ظبیان صاحب نے رابطہ کے مقاصد سے ہمیں متعارف کرتے ہوئے کہا۔ کہ "رابطۃ العلوم الاسلامیہ" ۱۹۵۱ء میں وجود میں آیا اسکی تاسیس کا مقصد عربی زبان کی نشر و اشاعت، دین حنیف کی دعوت کو عام کرنا،

عصر حاضرہ کے الحاد کا مقابلہ اور نئی روشنی کے نوجوانوں کے اخلاقی معیاروں کو بلند کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی، اقتصادی، طبی اور کئی دوسرے شعبوں میں مسلمانوں کی خدمت کرنا بھی رابطہ کے مقاصد میں داخل ہے۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے رابطہ نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً مختلف علمی موضوعات پر محاضرات کا بندوبست بھی شامل ہے۔ چنانچہ آج بھی مغرب کی نماز کے بعد رابطہ کے دفتر میں اسی سلسلے کا ایک محاضرہ "حقوق المراۃ فی الاسلام" کے موضوع پر ہوگا۔ محاضر کا نام شیخ محمد علی زعبی ہے جو کہ لبنان کے مشہور محقق عالم ہیں۔

تیسیر ظبیان صاحب کے تقاضہ پر ہم نے محاضرہ سننے کے لئے مغرب کی نماز کے بعد دوبارہ رابطہ کے دفتر میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ محاضرہ اپنے وقت پر شروع ہوا۔ اور کوئی دو گھنٹے تک جاری رہا۔ محاضرے کی اکثر باتیں میرے نزدیک تو عام اور مبتذل قسم کی تھیں۔ لیکن حاضرین جو جدید تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ تقریباً ہر بات پر داد و تحسین کی آوازیں بلند کرتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً جوش میں آکر تالیاں بھی بجا دیتے تھے۔ ویسے زعبی صاحب کی طرزِ ادا اور طریقۂ تفہیم نہایت مؤثر اور جذاب تھا۔

بطور مثال زعبی صاحب نے شرعی قانون میراث میں عورت کا حصہ مرد کے حصے کے نصف ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہا۔ کہ شریعت نے مرد کو اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا ذمہ دار بنایا ہے۔ اور عورت پر اس قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

عورت جب تک باپ کے گھر ہوتی ہے۔ تو وہ اس کے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور جب شوہر کے گھر چلی جاتی ہے۔ تو وہ اس کا اور اسکی اولاد کا نفقہ مہیا کرنے پر مکلف ہوتا ہے۔ اس لئے عدل و انصاف کا تقاضہ یہی تھا۔ کہ مرد کا حصہ ترکہ میں عورت کے حصے سے زیادہ ہو۔

اتنے سے نکتے کو حاضرین نے بہت سراہا۔ اور داد و تحسین کی آوازیں بلند کر دیں۔ زعبی صاحب نے محاضرہ جاری رکھتے ہوئے ایک قاعدہ بیان کیا۔ کہ اسلام نے بہت سے امور میں عورت کی ترکیب جسمی کا بھی خیال رکھا ہے۔ چنانچہ عورت کو بعض ان تکالیف پر مکلف نہیں بنایا گیا جو اسکی ترکیب جسمی کے منافی ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے جہاد کا ذکر کیا کہ عورت کی ترکیب جسمی کے پیش نظر عدل و انصاف کا تقاضی تھا۔ کہ اس پر جہاد فرض نہ کیا جائے۔ اور شریعت نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اگر عورت اپنی مرضی سے جہاد میں شرکت کرنا چاہے۔ تو شریعت اسکو روکتی بھی نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۵ پر)